محمد حنیف ندوی

اِسلام اور تصوّف

قانون و شریعت کے سانچوں پر اہل علم نے چار طریقوں سے غور کیا ہے۔ ایک اس طریق سے کہ مسائل و جزئیات کا تفصیلی نقشہ کیا ہے اور شریعت اسلامی کی وسعتیں کن کن جزئیات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ یہ فقہ ہے اور اس کے جاننے والے کو فقیہہ کہا جاتا ہے۔ غور و فکر کا دوسرا نہج یہ ہے کہ ان جزئیات و فروع کے پیچھے جو اصول، جو قانونی روح اور قواعد کلیہ کارفرما ہیں ان کا سراغ لگایا جائے۔ اس فن کو اصول کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے جاننے والے کو اصولی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ علم و فن کے اس مقام اور مجتہد کے مقام میں کیا فرق ہے اس کو معلوم کرنے کے لئے زیادہ کاوش درکار نہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ان میں ایک ہی قدم یا حیثیت کا فاصلہ حائل ہے۔ یعنی اگر ایک اصولی انہیں کلیات کو جن پر اس کو عبور و استحضار حاصل ہے جزئیات پر پھیلاتا یا ان سے جزئیات کو مستنبط کرتا ہے تو وہ مجتہد ہے۔ تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شریعت و فقہ کی جزئیات کو عقل و خرد اور فلسفہ و حکمت کی کسوٹیوں پر پرکھا جائے۔ یہ علم الکلام ہے اور تاریخ اسلامی میں ایسے حضرات کو متکلمین کہا جاتا ہے جو دین و دانش میں ربط و توافق تلاش کرتے ہیں اور مذہب کے لئے ایسے عقلی و فکری پیمانے مہیا کرتے ہیں جو شکوک و شبہات کو دور کر سکیں اور ذہنی و فکری اضطرار کے لئے ایک گونہ تسکین و طمانیت کا باعث ہو سکیں۔ غور و فکر کا چوتھا مگر زیادہ اہم اسلوب یہ ہے کہ جزئیات، رسوم و شعائر اور عبادات و اخلاق میں جو باطنی روح ہے اس کا کھوج لگایا جائے اور اس فلسفہ کی نشاندہی کی جائے جس کا تعلق دماغ کی اوپری سطح سے نہیں دل کی گہری اور عمیق کیفیتوں سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ اسلامی نظامِ حیات کے اندر ذوق و وجدان کی جو مناسبتیں پنہاں ہیں ان کو اجاگر کیا جائے اور ان حقائق کو منظر عام پر لایا جائے جن کو عطرِ دین

یا روحِ دین قرار دیا جا سکتا ہے۔ غور و فکر کا یہ انداز تصوف ہے۔

فقہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے اور اس کے مفہوم و معنی کی تعیین میں کوئی اختلاف رائے نہیں پایا جاتا۔ اختلاف رائے جو کچھ ہے وہ مدارس فکر میں ہے نفسِ حقیقت میں نہیں۔ لیکن تصوف کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ اس کی تعبیر و ترجمانی میں اچھا خاصا اختلاف رائے رونما ہے اور خصوصیت سے اس مسئلہ میں کہ اسلام کس نوع کے متصوفانہ افکار کا حامل ہے۔ اور اسلام کے نظامِ عقاید میں اس کا کیا درجہ و مقام ہے؟

لفظ تصوف کا مشتق منہ

صوفی کا ماخذ کون لفظ ہے اور اس کی اصل و اساس کیا ہے؟ اس کا جواب متفق علیہ نہیں۔ کچھ لوگ اسے صفا سے مشتق مانتے ہیں کسی کے نزدیک یہ صف سے نکلا ہے بعض نے اسے اصحاب صفہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ بعد کچھ حضرات دور کی کوڑی لائے ہیں، ان کے نزدیک یہ یونانی لفظ ہے۔ ایسے حضرات کی تعداد زیادہ ہے جو اسے صوف سے مشتق مانتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ پشمینہ یا صوف انبیاء اور اصحاب زہد کا لباس تھا لہذا اسی مناسبت سے ان لوگوں کو صوفی کہا گیا۔ ناصل آربری اور کلاباذی کی مشہور کتاب التعرف کے شارح کا رجحان اسی طرف ہے۔ لیکن یہ بوجوہ صحیح نہیں۔ ایک تو صرفی اعتبار سے یہ تمام انتسابات غلط ہیں، جیسا کہ عارف قشیری نے تصریح فرمائی ہے دوسرے تمام صوفیاء صوف یا پشمینہ پہننے کے قائل نہیں تھے، چنانچہ ابن سیرین نے تو اس پر بعض صوفیاء کو یہ کہہ کر ٹوکا بھی ہے کہ پشمینہ کا استعمال حضرت مسیح کی پیروی کے مترادف ہے اور ہم چونکہ آنحضرتؐ کے پیرو اور جاں نثار ہیں، اور آپؐ نے سوتی ملبوسات زیب تن کئے ہیں اس لئے آپ کے تتبع اور پیروی کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے ملبوسات سے آنحضرتؐ کی اطاعت کا ثبوت ملے، نہ یہ کہ ہمیں حضرت مسیح کے پیروکاروں میں شمار کیا جائے۔ تیسری اہم وجہ یہ ہے کہ صحیح اور اونچے پائے کے صوفیہ کے نزدیک لباس کی تعیین کسی درجے میں بھی ضروری نہیں۔

مولانا جامی نے نفحات الانس میں تصریح فرمائی ہے کہ پہلا شخص جو صوفی کے نام سے موسوم ہوا، ابوہاشم سفیان ثوری کا ہم عصر ہے۔ انہیں کیوں صوفی کہا گیا۔ اس کا ٹھیک ٹھیک سبب نہیں معلوم ہو سکا۔

ہمارے نزدیک اشتقاق و انتساب کی یہ بحث سرے سے لاحاصل ہے۔ کیونکہ تصوف ، لفظ و لقب سے کہیں زیادہ حقیقت کا نام ہے۔ ایک جیتی جاگتی زندگی سے تعبیر ہے اور ایک خاص انداز زیست اور نقطۂ نظر کا مظہر ہے۔ جس کا تعلق صفائے قلب و باطن سے بھی اتنا ہی ہے جتنا پاکبازانِ اسلام کی صف سے۔ اسی طرح اصحابِ صفہ کی طرح ، دنیا کے مزخرفات سے بے نیاز حضرات سے بھی ان کو شرفِ انتساب حاصل ہے اور سادہ زندگی اختیار کرنے والے پشمینہ پوش زہاد سے بھی ان کا تعلق ثابت ہے۔

تصوف کا نقطۂ آغاز

اس کا آغاز کب ہوا اور کب اس نے ایک فلسفۂ حیات کی متعین شکل اختیار کی ؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ جو درحقیقت دو سوالوں پر مشتمل ہے ایک یہ کہ اس کے نقطۂ آغاز کی تعیین کی جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کی ارتقائی کڑیوں کو نظر و بصر کے سامنے لایا جائے۔ اب جہاں تک سوال کے اس حصہ کا تعلق ہے کہ اس جاں بخش اور حیات آفریں تحریک کے نقطۂ آغاز کی تعیین کی جائے۔ اس کے بارہ میں دو ٹوک اور فیصلہ کن بات کہنا مشکل ہے۔ کیونکہ دینی و علمی تحریکیں اپنے سفر کا آغاز کسی متعین وقت سے نہیں کرتیں۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ابتدا میں فکر و عمل کے کچھ سادہ نقطے معاشرہ کی سطح پر ابھرتے ہیں۔ اور پھر وقت کی رفتار اور مناسبتوں سے یہی نقطے متعین نقوش کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جن میں رنگ و روغن بھی ہوتا ہے اور شوخی اور جلا بھی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی علمی و دینی تحریک یکایک اپنے تمام لوازم اور خصوصیات کے ساتھ آن کی آن میں ابھر آئے۔ تدریج و ارتقاء فطرت کا ہمہ گیر ، اور اٹل اصول ہے۔ جس سے تصوف کو کسی طرح بھی مستثنیٰ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اگر یہ مفروضہ صحیح ہے تو اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ تصوف کو بھی شروع شروع میں بس ایک بیج ہی تصور کیا جائے جس کے مضمرات نمو ابھی پنہاں اور مستور رہیں۔ اس کو ایک صالح معاشرہ میں بکھیرا گیا جو اس کے لئے بمنزلہ زمین کے تھا۔ یا جیسے کھیتی کہہ لیجئے۔ پھر وقت و ماحول کی سازگاریوں نے آہستہ آہستہ اس کو اگایا اور بڑھایا۔ یہاں تک کہ تھوڑے سے ہی عرصہ میں اس نے ایک بارآور اور تنومند درخت کی شکل اختیار کر لی جس کے فیوض کبھی ختم ہونے والے نہیں۔

وَمَثَلُهُمْ فِى الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ ۔ فتح ۲۹

انجیل میں ان لوگوں کے اوصاف یوں بیان کیے گئے ہیں، وہ گویا ایک کھیتی ہیں، جس نے پہلے زمین سے اپنی سوئی نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر موٹی ہوئی اور اپنی نالی پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اب کسان ہیں کہ اسے دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہے ہیں۔

توتی اکلها کل حین باذن ربها (ابراہیم ۲۵)

اپنے پروردگار کے حکم سے یہ شجرہ طیبہ ہر وقت میوے اور پھل سے لدا رہتا ہے۔

یہ پہلا معاشرہ جس میں معرفت و تصوف کے بیج بوئے گئے، صحابہ رضوان علیہم اجمعین کا معاشرہ ہے ان میں تقویٰ، اخلاص اور محبت و عشق الٰہی کے وہ تمام مضمرات موجود تھے جنہوں نے آگے چل کر تصوف اور صوفیاء کی شکل اختیار کی ان کی زندگی کا کیا رنگ ڈھنگ تھا۔ قرآن نے اس پر پوری طرح روشنی ڈالی ہے۔

تتجافی جنوبهم عن المضاجع ۔ سجدہ ۲۹

ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں۔

اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ زاہدان شب زندہ دار ہیں۔ یہ نرم اور گرم بستروں پر سونے کے بجائے راتوں کو اٹھ اٹھ کر یاد الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ یعنی رات ان کے لیے وہ تاریک اور اکتا دینے والا لمبا عرصہ نہیں کہ انہیں ایک عربی شاعر کے ہمنوا ہو کر کہنا پڑے۔ ع

الا ایها اللیل الطویل الا انجلی ۔

اے نہ ختم ہونے والی لمبی رات، تو کبھی صبح کی سپیدی سے بدلے گی بھی یا نہیں۔

بلکہ یہ زبان حال سے اس کے برعکس یوں کہتے ہیں۔

لیلی بوجهك مشرق وظلامة فی الناس ساری

میری رات تیرے چہرۂ روشن کی وجہ سے روشن اور مستنیر ہے حالانکہ دوسروں میں اس کی ظلمتوں کا دور دورہ ہے۔

والناس فی سدف الظلا م ونحن فی ضوء النهار

لوگ رات کی تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ اور ہم دن کی کھلی روشنی میں سانس لے رہے ہیں۔

ان کے ذوقِ عبادت کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے :۔

تراهم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من الله ورضواناً۔ فتح ۲۹ — تو ان کو دیکھتا ہے کہ خدا کے آگے جھکے ہوئے سربسجود ہیں اور خدا کا فضل اور خوشنودی طلب کر رہے ہیں

سب سے بڑھ کر یہ کہ :۔

والزمهم کلمة التقوىٰ فتح ۲۶ — اور ان کو پرہیزگاری کی بات پہ قائم رکھا۔

کیا زہد و تقویٰ کی یہی صورتیں اصل تصوف نہیں ؟

صحابہ سے ہماری مراد باصطلاح محدثین وہ نہیں جن کو آنحضرت کی صحبت کم از کم ایک مرتبہ نصیب ہوئی ہو۔ اگرچہ یہ رتبہ بھی اپنی جگہ کچھ کم نہیں۔ ہمارے نزدیک صحابہ سے مقصود وہ نفوس قدسیہ ہیں جن کو صلحاء و اتقیاء کا میر قافلہ کہا جا سکتا ہے جو حضور کی صحبت و رفاقت سے باقاعدہ مستفید ہوئے جنھوں نے آغوشِ نبوت میں تعلیم و تزکیہ کی منزلیں طے کیں اور جلوت و خلوت میں ساتھ رہے جنھوں نے دنیا کو ہمیشہ مرجوح اور ناقابلِ التفات سمجھا اور دینی اقدار کو ہمیشہ راجح ، اور جن کی مملکت فقر میں غنائم اور فتوحات کی کثرت کوئی تغیر نہ پیدا کر سکی۔ دوسرے لفظوں میں جن کی استقامت کا یہ عالم رہا کہ ایک دفعہ اگر تقوٰے و عفاف کی راہ پر قدم بڑھائے تو آخر تک اس رسمِ عشق کو نبھانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ ہم انہیں صوفی صحابہ کے نام سے موسوم کریں گے۔ اس فہرست میں پہلے تو خلفاءِ اربعہ کے نام مندرج ہوں گے اور اس کے بعد ایسے تمام صحابہ کے جو بالطبع متصوف تھے اور جن کی زندگی اور سیرت و کردار کا نقشہ کسی طرح بھی ان لوگوں سے مختلف نہیں۔ جن کو آگے چل کر ہم نے عارف و صوفیاء کے لقب سے پکارا۔ جیسے حضرت سلمان، حضرت ابوذر غفاری، حضرت صہیب، حضرت بلال اور حضرت عمار بن یاسر وغیرہ۔

مثالیں ہمیشہ گمراہ کن ہوتی ہیں۔ ہم نے صحابہ رضوان اللہ علیہم کے بارہ میں جو یہ کہا ہے کہ ان میں تصوف کا ابتدائی سادہ نقشہ پایا جاتا تھا ، اور یہ گلشنِ تصوف کے وہ گل بوٹے تھے جو آگے چل کر خوب کھلے اور مہکے

اور جن کی شمیم انگیزیوں نے ایک عالم کو روحانی انبساط بخشا۔ تو اس کا خدانخواستہ یہ مطلب نہیں کہ بعد میں آنے والے مراتب و کمالات میں ان سے آگے بڑھ گئے۔ اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ تصوف مصطلحہ نے آئندہ چل کر تقویٰ و اخلاص کا جو معیار مقرر کیا، اس کے لئے جو اصول وضع کئے، جو قاعدے ٹھہرائے اور جو سانچے ڈھالے اور قلب منیر کے جن جن لطائف کی نشاندہی کی، ان حضرات کی زندگیوں میں اس کی سادہ اور ابتدائی مثالیں ملتی ہیں، چنانچہ ان میں وہی ذوقِ عبادت ہے، وہی اللہ تعالیٰ سے ربط و تعلق کا عالم ہے، وہی محبت و شوق کے داعیے ہیں، وہی اصول کی پاکیزگی اور یقین و اذعان کے پیمانے ہیں، جن کو تصوف کا مابہ الامتیاز قرار دیا جاسکتا ہے۔

حضرت ابوبکر کے سوانح سے کون ناواقف ہے؟ اور ان کے رتبہ صدیقیت کی جو بلندیاں ہیں ان کو عرفان و سلوک کے دائروں سے کون الگ کر سکتا ہے؟ بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ہمیں بعض مستشرقین کی اس سلسلے سے اتفاق ہے کہ اگر آنحضرت ؐ کے بعد کسی شخص کو منصب نبوت کے قریب تر ٹھہرایا جا سکتا ہے تو وہ انھیں کی ذات گرامی ہے۔ حضرت عمر فاروق کے مرتبہ اجتہاد اور زندگی کی تالجدِ خشونت سادگی اور تورع سے کس کو انکار ہے؟ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مقام تصوف کا اعلیٰ ترین مقام نہیں؟ انہوں نے اسلام کی نعمتوں کو جس طرح عام کیا ہے اور فریضہ جہاد کے تقاضوں کو جس طرح ادا کیا ہے؟ اس کے تئے رہتی دنیا تک اسلامی دنیا ان کی ممنون احسان رہے گی۔ حضرت عثمان نے اپنی دولت سے جسطرح ریاض نبوت کو سینچا، جس طرح حیاء و عفاف کا ثبوت دیا۔ اور جس استقلال سے حرزۂ خلافت کی حفاظت کی۔ اس کی شہادت پر خود ان کی شہادت گواہ ہے! اسی طرح حضرت علیؓ کی جامع الصفات شخصیت کون بھول سکتا ہے؟ جن میں مع شئ زائد تمام صحابہ کی اداہائے خاص کی کچھ کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ ایک معنی میں صدیق بھی ہیں۔ کیونکہ ان سابقین و اولین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جنہوں نے ایمان کے معاملہ میں سبقت کی۔ فاروقیت کا انعکاس بھی ان میں پایا جاتا ہے کہ ان سے زیادہ قضاء و فقہ کی موشگافیوں کو جاننے والا کوئی دوسرا نہیں۔ دولت نے اگرچہ کبھی بھی ان کے دامنِ طلب کو آلودہ نہیں کیا، تاہم یہ واقعہ بھی تاریخ کے اوراق میں ثبت ہے کہ بیت المال تک کے سرمایہ کو جب تک مستحقین میں بانٹ

نہیں دینے تھے چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کا مقام حضرت عثمان غنی سے کسی طرح بھی گھٹ کر نہیں رہتا۔ رہا عفاف و شہادت کا معاملہ تو اس میں بھی ان کا حریف کون ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ان میں بلال کا عشق، ابوذر کا فقر اور عمار بن یاسر کا صبر و استقامت بھی پورے کمال کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ اگر زہد و ورع، سیرت و عمل کی پاکیزگی و بلندی اور ایمان و ایقان کی محکمی و استواری ایسی صفات حسنہ کو ہم تصوف کی اولین اساس اور ضروری بنیاد قرار دیتے ہیں۔ تو لامحالہ ہمیں ماننا پڑے گا۔ کہ اس کی تاریخ کا نقطۂ آغاز یہی بابرکت ہستیاں ہیں۔ اور انھیں سے عرفان و سلوک کے مختلف سوتے پھوٹے ہیں۔

دوسری ارتقائی کڑیاں۔

سوال کے دوسرے حصہ کا منشا یہ ہے کہ ارتقائی کڑیوں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس مرحلہ پر ہمیں زیادہ رکنا نہیں ہے اس سلسلہ میں صرف اس قدر رجان لینا کافی ہے کہ صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا دور شروع ہوتا ہے۔ اور اسی دور کے ساتھ ملا ہوا وہ دور ہے جس میں زہد و ورع نے باقاعدہ ایک نظریۂ حیات اور شعار کی حیثیت اختیار کر لی۔ تابعین اور تبع تابعین کا دور کہاں ختم ہوتا ہے۔ اور صوفیاء کے دور کا آغاز کن نقاط سے ہوتا ہے؟ اس کی سرحدوں کی تعیین سخت دشوار ہے۔ تاریخ سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اختتام تک اسلامی معاشرہ میں ایک متعین گروہ ایسا پیدا ہو چکا تھا۔ جنھیں لوگ صوفیاء کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اور تیسری اور چوتھی صدی ہجری تک اس نظریۂ حیات اور زندگی کے خاص سلوب و منہج نے نہ صرف پورے عالم اسلامی میں اچھا خاصا فروغ حاصل کر لیا تھا بلکہ اپنی تبلیغی کوششوں کو ایک تنظیم کی شکل دے دی تھی۔ اور اپنے علوم و معارف کو مدون کر لیا تھا۔ بلکہ ان میں ایسے ایسے منحرفانہ اور بدعی فرقے بھی پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے جن کو تصوف و اسلام کے بنیادی عقائد سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ یہی نہیں جو صحیح العقیدہ صوفیا کے لئے باعث بدنامی تھے۔ انہیں کے بارہ میں عارف قشیری نے کہا:۔

ان الخیام فانہا کخیامہم وان نساء الحی غیر نساءھا

ان کے خیموں کی سج دھج اور وضع تو وہی ہے۔

مگر اس قبیلہ کی وہ حسین عورتیں کہاں ہیں جن پر میں جان چھڑکتا تھا۔

اس سلسلہ میں ابن سینا نے اشارات میں جو کچھ کہا ہے، اس سے ترتیب ارتقار کا صحیح نقشہ نظر و بصر کے سامنے آجاتا ہے:

المعرض عن متاع الدنیا وطیباتھا یخص باسم الزاھد والمواظب علی فعل العبادات من القیام و الصیام ونحوھما یخص باسم العابد والمنصرف بفکرہ الی قدوس الجبروت مستنیراً لشروق نور الحق فی سرہ یخص باسم العارف وقد یترکب بعض ھذہ مع بعض۔

جو شخص متاع دنیا اور اس کے طیبات سے سے اعراض کناں ہوا اس کو زاہد کہا گیا، جس نے عبادات مثل صوم وصلوٰۃ اختیار کی، اس کو عابد کے نام سے پکارا گیا اور جس نے غور و فکر کی قوتوں کو قدس جبروت کی جانب متوجہ کیا اور اسرار حق سے مستنیر ہوا اور باطن کو سنوارا اسے عارف کے لقب سے نوازا گیا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان گروہوں میں کوئی خط امتیاز کھینچا جا سکتا ہے، یہ طبقے آپس میں باہم مختلط بھی ہو جاتے ہیں۔

افکارِ غزالی

مصنفہ:۔ محمد حنیف ندوی

امام غزالی کے شاہکار "احیاء العلوم" کی تلخیص اور ان کے افکار پر سیر حاصل تبصرہ،

صفحات ۵۰۰ — قیمت ۵۰/۸ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور